واسطے خاص "فخری" تخلص ہے، کہوگے کہ آزاد پور کے باغ میں ایک آم کا نام "فخری" ہے، حاصلِ کلام دو دن کی فکر میں جو تخلص میرے خیال میں آئے، وہ آج لکھ بھیجتا ہوں، بھائی "موبد" تخلص نیا ہے اگر یہ پسند آئے تو یہ رکھو۔ والدعا۔

صبح یکشنبہ ۱۲ مئی ۱۸۶۱ء نجات کا طالب غالب

(۸)

میری جان، علائی ہمہ دان!

اس دفعِ دخلِ مقدر کا کیا کہنا ہے! "فرہنگ لغات دساتیر" تمھارے پاس ہے، میں چاہتا تھا کہ اُس کی نقل تم سے منگاؤں۔ تم نے "دساتیر" مجھ سے مانگی۔ اُسی صحیفۂ مقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہوگے کہ اگر "دساتیر" نہیں تو فرہنگ کی خواہش کیوں ہے؟ حق یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں، اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے۔ اگر اُس فرہنگ کی نقل بھیج دوگے تو مجھ پر احسان کروگے۔ "دساتیر" میرے پاس ہوتی تو آج اس خط کے ساتھ اُس کا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب، اگر "دساتیر" ہوتی اور میں بھیج دیتا تو البتہ بھائی صاحب کا مشکور ہوتا، دین و دنیا میں کیوں ماجور ہوتا؟ ارسالِ اہدا پر حصولِ اجر کیوں مترتب ہوگیا؟ بھائی وہ مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں اور تم اُس مذہب کو حق جانتے ہو کہ میں جو واسطہ اس کے اعلان و شیوع کا ہوتا تو عنداللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ اور ایک شعر میرا اور ایک شعر حافظ کا اور ایک شعر مولوی روم کا سُناؤ:

غالب

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نہ توانی شد، ناچار مسلماں شو

حافظ

جنگِ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت، رہِ افسانہ زدند

مولانا

مذہب عاشق ز مذہب ہا جدا است
عاشقاں را مذہب و ملّت خدا است

رات کو خوب مینہہ برسا ہے، صبح کو تھم گیا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے، ابر تنک چھا رہا ہے۔

یقین ہے کہ تمھاری جدہ ماجدہ مع اپنی بہو اور پوتے کے روانۂ لوہارو ہوں، کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔ یہ لڑکا سعیدِ ازلی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسایش کے واسطے ہے۔ میرا منظر سرِ راہ ہے، وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔

بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں۔؟

حضرت ابھی نہیں۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔

مرقومۂ شنبہ یکم جون وقتِ صبح چھے بجے سات کے عمل میں ۱۸۶۱ء غالب

(۹)

جانِ غالب!

یاد آتا ہے کہ تمھارے عمِ نامدار سے سُنا ہے کہ "لغاتِ دساتیر" کی فرہنگ وہاں ہے، اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے، خیر:

آنچہ ما در کار داریم، اکثرے درکار نیست

تم ثمرِ نورس ہو اُس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اُس نہال کا رہا ہوں کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہوگے۔ رہی دید وادید، اُس کی دو صورتیں، تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود

کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ اور پھر آپ جواب دیتا ہے لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّار ہرچند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا[3]۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا۔

۷ رجب[4] ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر[5] نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل[6] خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی، طاقت یک[7] قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ[9] میں چھوٹ جاؤں۔ بہ ہر تقدیر، بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات[8] سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا:

فرخ آنروز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں۔ دو فارسی غزلیں دو اردو غزلیں اپنے

حافظے کی تحویل میں سے[1] بھیجتا ہوں بھائی صاحب کی نذر:

غزل

از جسم بہ جاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے
ایں گوہر پُر فروغ، یارب
آلودۂ خاک و آب تا کے
ایں راہروِ مسالک قدس
واماندۂ خورد و خواب تا کے
بیتابیِ برق جز دمے نیست
ما و بیں ہمہ اضطراب تا کے
جان در طلبِ نجات تا چند
دل در تعبِ عتاب تا کے
پرسش زِ تو بے حساب باید
غم ہاے مرا حساب تا کے
غالب بہ چنیں کشاکش اندر
یا حضرتِ بوتراب تا کے

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روے تو بود
چشتم سوے فلک و روے سخن سوے تو بود
آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بہ عتاب
نفسم پردہ کشاے اثر خوے تو بود

چہ عجب صانع اگر نقشِ دہانت گم کرد
کو! خود از حیرتیانِ رخِ نیکوے تو بود
یہ کفِ باد مباد ایں ہمہ رسوائیِ دل
کا خر از پروگیانِ شکنِ موے تو بود
مردن و جان بہ تمناے شہادت دادن
ہم زِ اندیشۂ آزردنِ بازوے تو بود
دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند
کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروے تو بود
لالہ و گل دمد از طرف مزارش پسِ مرگ
تا چہا در دل غالبؔ ہوسِ روے تو بود

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
لوگوں کو ہے خُرشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
یارب! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

مرتا ہوں اِس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور۔
ہیں اور بھی دُنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
ضد کی ہے اور بات، مگر خُو بری نہیں
بھُولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کِس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
غالبؔ تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ
جون ۱۸۶۱ء